AL-HAYAT Research Journal
Volume 3 Issue 4 (July-Sep 2026)
ISSN (Online): 3006-4767
ISSN (Print):: 3006-4759
HJRS HEC Journal Recognition System Category Y

منتخب معاصر ہندوستانی شعرا کی غزل میں تشکیک پسندی

Skepticism in the ghazals of contemporary Indian poets

Razwan Anwar
Lecturer Urdu, F.G Degree College, Gujranwala Cantt

Dr. Ammara Tariq
Associate Professor, Department of Urdu, University of Education, Bank road Campus, Lahore

Abstract

Questioning certainty has remained one of the most enduring impulses of human thought and contemporary Urdu ghazal reflects this tendency in diverse and meaningful ways. Emerging from a landscape marked by social change, existential anxieties and shifting value systems, skeptical consciousness has become a significant feature of modern poetic expression. This article investigates the presence and function of skepticism in the ghazals of selected contemporary Indian poets. Through a close reading of representative texts, it examines how doubt, uncertainty and the interrogation of accepted truths shape poetic discourse. The analysis reveals that skepticism in these ghazals transcends mere negation; it serves as a creative mode of inquiry that reconsiders identity, reality, human relationships and cultural assumptions. The study concludes that skeptical thought has expanded the intellectual and aesthetic horizons of the contemporary ghazal, making it a dynamic medium for engaging with the complexities of modern life.

Keywords: Skepticism, Contemporary Indian Poetry, Urdu Ghazal, Modern Urdu Literature, Critical Consciousness, Existential Inquiry

ادب کی سرحدیں جغرافیے کی پابند نہیں ہوتیں۔ زبان اور احساس جہاں بھی سانس لیتے ہیں وہیں سے اپنے سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ اسی تناظر میں سرحد پار سے یعنی بھارتی اردو شعرا کے کلام کو پیش نظر مضمون میں جگہ دی گئی ہے۔ برصغیر کے اس مشترکہ تہذیبی پس منظر میں پروان چڑھنے والی اردو غزل جب مختلف معاشرتی، مذہبی اور فکری ماحول سے گزرتی ہے تو اس کے موضوعات میں بھی نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ انھی زاویوں میں ایک اہم زاویہ **تشکیک** کا ہے۔ تشکیک سے مراد شک، شبہ، تذبذب، تردد، تجسس، گمان، گومگو کی حالت، شک میں پڑنا اور شک میں ڈالنا وغیرہ ہے۔ تشکیک انسانی فکر کا وہ جستجو آمیز رویہ ہے جو ہر مروجہ خیال، مسلمہ حقیقت اور قطعی دعوے کو سوال کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ یہ محض انکار یا نفی کا نام نہیں بلکہ حقیقت تک رسائی کے لیے یقین، علم اور ادراک کی بنیادوں کا تنقیدی جائزہ لینے کا عمل ہے۔ اس طرح تشکیک ذہن کو تقلید کی پابندی سے نکال کر تحقیق، تجسس اور نئے امکانات کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تشکیک، سوال کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ سوال ہی ہے جو اسے رائج تصورات اور مسلّمات کی تہہ تک پہنچنے اور ان کی صداقت کو پرکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ہمسایہ ملک بھارت کے اردو شعرا کی غزل میں تشکیکی رویہ ایک خاص فکری گہرائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ زیر نظر تحقیقی مضمون کے عنوان میں لفظ "معاصر" اس تناظر میں شامل کیا گیا ہے کہ یہاں منتخب بھارتی شعرا کے اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے فن پاروں میں تشکیکی عناصر کی موجودگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مطالعہ میں شامل سید امین اشرف، شہریار، ندا فاضلی، شاہد ماہلی، شہپر رسول، ماجد دیوبندی اور اقبال اشہر جیسے شعرا کی غزلیہ شاعری میں مذہبی، فلسفیانہ اور روایتی مضامین و موضوعات میں تشکیک پسندی کے پہلو زیر بحث لائے گئے ہیں۔

سید امین اشرف (۱۹۳۰ء۔ ۲۰۱۳ء) معروف ہندوستانی اردو غزل گو شاعر اور نقاد تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سروجنی نائیڈو کی شاعری پر انگریزی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی وفات بوجہ ہارٹ اٹیک علی گڑھ میں ہوئی تاہم انھیں اپنے آبائی قصبے کچاوچھ شریف میں واقع اشرف جہانگیر سمنانی کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا۔ سید امین اشرف کی شعری تصانیف میں "جادۂ شب"، "بہارِ ایجاد" اور "قفس رنگ" شامل ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی سید امین اشرف کی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

OPEN ACCESS
CC BY

"مشکل اس وقت آتی ہے جب سید امین اشرف جیسے شاعر سے سابقہ پڑے۔ ان کے لیے کوئی نمونہ (Paradigm) دریافت کرنا محال ہے۔ ان کی غزل کو کسی ایک چوکھٹے، یا دو چار چوکھٹوں میں ڈال کر دیکھنا یاد کھانا اپنا ہی منہ چڑانا ہے۔ بجا کہ وہ عشقیہ شاعر ہیں یا عشق کے معاملات کی پیچیدگیاں، زندگی میں عشق کے لائے ہوئے تضادات، نفرت یا اکتاہٹ اور کشش کے درمیان آویزش کا کرب، یہ سب ان کے یہاں بہت خوبی سے بیان ہوا ہے، اتنی خوبی سے کہ اس کی مثال عہد حاضر کی اُردو غزل میں نہیں مل سکتی۔"(۱)

اس سے سید امین اشرف کے کلام کی فکری وسعت، موضوعاتی تنوع اور داخلی پیچیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں عشق محض ایک روایتی جذبہ نہیں بلکہ انسانی وجود، جذبات اور زندگی کے مختلف تضادات کو سمجھنے اور پرکھنے کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی غزل میں پائی جانے والی تشکیکی کیفیتیں بھی قابلِ توجہ ہیں جن کے تحت یقین و گمان، کشش و نفرت اور وصل و ہجر کے باہمی تضادات انسانی ذہن کی داخلی کشمکش کو نمایاں کرتے ہیں۔ ذیل میں سید امین اشرف کی غزل میں تشکیک کے مختلف فکری اور فنی مظاہر کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ہجر و فراق اردو غزل کے روایتی موضوعات ہیں۔ ہجر اتنا روح فرسا ہے کہ ایامِ وصل میں بھی اس کے متعلق سوچ کر جھرجھری آتی ہے۔ شاعر اپنے دل سے سوال کناں ہے کہ محبوب سے بچھڑنے پر کیا حالت ہوگی؟ یہ شعر اس داخلی بے یقینی کو نمایاں کرتا ہے جو انجام سے پہلے ہی دل کو سوالوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ فراق کے بعد دل کا کیا بنے گا؟ یہ سوال محض جذباتی اندیشہ نہیں بلکہ محبت کے ہر دعوے پر ایک ہلکی سی تشکیک بھی ہے۔ کبھی تبسم سے شہادت تو کبھی نگاہ سے قتل ہو جانا یہ بدلتی ہوئی کیفیات اس بات کی علامت ہیں کہ عشق میں وارد ہونے والے زخم کی نوعیت تو بدلتی رہتی ہے مگر انجام ہمیشہ غیر واضح رہتا ہے۔ یہ **روایتی عشقیہ تشکیک** ہے جس میں یقینِ محبت کے باوجود دل اپنے ہی مستقبل پر مطمئن نہیں ہو پاتا۔

بچھڑ کے ان سے دلِ بے قرار کیا ہوگا
وہ یاد آئے گا بار بار کیا ہوگا
کبھی شہیدِ تبسّم، کبھی قتیلِ نگاہ
مآل اے دلِ آشفتہ کار کیا ہوگا (۲)

زیر نظر غزل کی ردیف "کیا ہے" سے امین اشرف نے متعدد سوالات اٹھائے ہیں۔ اسی سے ماخوذ یہ اشعار ایک ایسی فکری کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے زیر اثر انسان کی کائنات میں اپنی سمت، اپنی ابتدا اور اپنی انتہا سب کچھ ایک ساتھ سوال بن جاتے ہیں۔ یہاں نقل مکانی صرف جسمانی حرکت نہیں بلکہ شعور کی وہ بے قراری ہے جو ہر سمت کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ شاعر تازہ ہوا، آغاز، انجام اور خود بشر کی ماہیت پر سوال اٹھا کر اس یقین کو منہدم کرتا ہے کہ زندگی کسی واضح نقشے کے مطابق چل رہی ہے۔ "کارِ نقش گر" اور "حیرت کا سفر" دراصل اسی فلسفیانہ تشکیک کی علامت ہیں جہاں انسان معنی کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے مگر ہر جواب نئے سوال کو جنم دیتا ہے۔ اس میں حیرت خود علم کی پہلی شرط بن کر سامنے آتی ہے۔

ہے کیوں نقل مکانی یہ ہوائے تازہ تر کیا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا ادھر کیا ہے ادھر کیا ہے
نمودِ ابتدا کیا، انتہا کیا ہے بشر کیا ہے
یہ کارِ نقش گر کیوں ہے یہ حیرت کا سفر کیا ہے (۳)

گزشتہ سے پیوستہ یہ شعر وجود کے سب سے بنیادی تضاد کو آواز دیتا ہے جہاں نابود بھی ایک طرح کا بود بن جاتا ہے اور مکان و لا مکان کی سرحدیں مٹنے لگتی ہیں۔ شاعر کے ہاں کوئی جگہ یا مقام حتمی شناخت نہیں رکھتا۔ زیر بحث امر یہ ہے کہ انسان کو اپنے ہونے کی خبر کہاں سے ملے؟ ذات، مقام اور معنی سب کے غیر یقینی ہو جانے کی کیفیت وجودی اور فلسفیانہ تشکیک کی نمائندہ ہے۔ یہاں یقین کی جگہ ایک ہمہ گیر بے سمتی نے لے لی ہے۔

نہ ہونا بھی ہے ہونا بے مکانی لا مکانی ہے
سر کہسار یا فرشِ زمیں پر ہوں خبر کیا ہے (۴)

شہریار (۱۹۳۶ء۔ ۲۰۱۲ء) کا اصل نام کنور محمد اخلاق تھا۔ غزل، نظم اور گیت نگاری میں شہرت حاصل کی۔ انھوں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی تحریک پر قلمی نام شہریار اختیار کیا۔ ان کا تعلق بھارتی ریاست اترپردیش، ضلع بریلی کے قصبہ آنولہ سے تھا۔ جامعہ علی گڑھ سے ایم۔ اے اردو کرنے کے بعد وہیں سے بطور لیکچرار اُردو پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ ان کی تصانیف میں "اسم اعظم"، "ساتواں در"، ہجر کے موسم"، "خواب کا در بند ہے"، "نیند کی کرچیں" اور "شام ہونے والی ہے" وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان سے "کلیاتِ شہریار" جب کہ بھارت سے "سورج کو نکلتا دیکھوں" کے عنوان سے ان کی کلیات منظر عام پر آچکی ہے۔ ڈاکٹر گلزار احمد وانی شہریار کی شعری کائنات کے متعلق خامہ فرسا ہیں کہ

"شہریار جدید شاعری کی نمائندہ آواز ہے۔ اگر ان کے کلام کو جدید شعری منظر نامے سے نکال دیا جائے تو جدید شاعری میں جیسے ایک ادھورا پن سا محسوس ہو سکتا ہے۔"(۵)

CC BY

شہر کے بیچوں بیچ ایک ایسا منظر بسا ہوا ہے جہاں قدم تو موجود ہیں مگر سمتیں گم ہیں۔لوگ رکے ہوئے ہیں، خاموش ہیں اور اس خاموشی میں ایک سوال مسلسل جنم لیتا ہے کہ آخر یہ جمود کیوں ہے؟ شاعر اس حیرت کو موضوع بناتا ہے اور اجتماعی زندگی کے ایک ایسے المیے کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں حرکت کا فقدان اور رہنمائی کی کمی انسان کو تشکیک میں مبتلا کر دیتی ہے۔پہلے شعر میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ اگر تمام لوگ ایک ہی مقام پر ٹھہر گئے ہیں تو کیا آگے بڑھنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا؟ جب کہ دوسرے شعر میں شاعر حکمران وقت کی بے حسی پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے اور حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ شہر میں ہونے والے حالات اس کی نگاہ سے اوجھل کیسے رہ سکتے ہیں؟یہ اشعار قاری وسامع کو یقین اور گمان کے درمیان معلق رکھتے ہیں اور سماجی و سیاسی صورتِ حال پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تشکیک یہاں سماجی و سیاسی نوعیت کی ہے کیوں کہ اس میں معاشرتی جمود، قیادت کی کارکردگی اور اجتماعی رویّوں کے بارے میں سوال اٹھانے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

تمام خلقِ خدا اس جگہ رکی کیوں ہے
یہاں سے آگے کوئی راستہ نہیں ہے کیا
مَیں ایک عرصے سے حیران ہوں کہ حاکمِ شہر
جو ہو رہا ہے اسے دیکھتا نہیں ہے کیا (۶)

مسلسل خاموشی بھی تشکیک کا باعث بن سکتی ہے۔ایسے میں آوازیں نہیں بلکہ خاموشیاں سوال بن جاتی ہیں۔جب گفتگو کی جگہ سکوت لے لے اور چہروں پر پھیلی ہوئی خاموشی کسی معنی کی طرف اشارہ نہ کرے تو انسان اپنے گردوپیش کی حقیقت ہی پر شک کرنے لگتا ہے۔ایسی فضا میں موجود ہر شخص ایک معما محسوس ہوتا ہے اور محفل اپنی مانوس شناخت کھو بیٹھتی ہے۔پیش نظر بیت میں شاعر اسی اجنبیت اور حیرت کی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔وہ خود کو ایک ایسی مجلس میں پاتا ہے جہاں سب موجود ہیں مگر کسی کی زبان نہیں کھلتی۔ یہ غیر معمولی خاموشی شاعر کے ذہن میں سوال پیدا کرتی ہے کہ وہ کہاں آ گیا ہے اور اس محفل کی اصل نوعیت کیا ہے؟مشاہدے، ماحول کے ادراک اور انسانی رویّوں کی پراسراریت پر پیدا ہونے والے اس شک کو ادراکی و نفسیاتی تشکیک کی مثال کہا جا سکتا ہے۔

کیسی محفل ہے یہاں مَیں کس طرح سے آگیا
سب کے سب خاموش بیٹھے ہیں کوئی گویا نہیں (۷)

جدائی بعض اوقات حقیقت کے نقوش کو دھندلا دیتی ہے۔انسان جس شے کو کھو دیتا ہے وہ اس کے شعور پر اس قدر غالب آ جاتی ہے کہ ہر منظر میں اسی کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ایسے میں مشاہدہ اور حقیقت کے درمیان فاصلہ کم ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے ادراک کی صحت پر سوال اٹھانے لگتا ہے۔زیرِمشاہدہ کلام میں شاعر اسی کیفیتِ انتشار اور فریبِ نظر کو بیان کرتا ہے۔محبوب کی جدائی میں ہر طرف اسی کا عکس یا اس سے ملتی جلتی صورتیں دکھائی دیتی ہیں،گویا یادداشت حقیقت پر غالب آ گئی ہو۔دوسرے شعر میں شاعر اپنے مشاہدے ہی کو مشکوک قرار دیتا ہے۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس کی اپنی آنکھیں نہیں بلکہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کیوں کہ اندھیرے میں بھی اجالا دکھائی دے رہا ہے۔اس طرح حقیقت اور تاثر کی سرحدیں باہم گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔چوں کہ ان اشعار میں شک خارجی دنیا کے بجائے دیکھنے، محسوس کرنے اور حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت پر ہے۔اس لیے یہ ادراکی اور نفسیاتی تشکیک کی عمدہ مثال ہیں۔

تری جدائی میں کیا کیا دکھائی دیتا ہے
کہیں پہ تُو کہیں تجھ سا دکھائی دیتا ہے
یہ میری آنکھیں نہیں دوسروں کی آنکھیں ہیں
اندھیرا ہے پہ اجالا دکھائی دیتا ہے (۸)

انسان بعض اوقات اپنے ہی احساسات کے سامنے خود کو بے بس پاتا ہے۔وہ کسی مقام، شخص یا یاد سے دور بھی رہنا چاہتا ہے اور اسی کی طرف کھنچا بھی چلا جاتا ہے۔ایسی کیفیت میں خوف کی اصل وجہ واضح نہیں ہوتی بلکہ دل کسی انجانے اندیشے میں مبتلا رہتا ہے اور قدم غیر ارادی احتیاط اختیار کر لیتے ہیں۔زیرِ نظر شعر میں شاعر محبوب کی گلی سے دبے پاؤں گزرنے کی وجہ دریافت کرتا ہے۔وہ خود اپنے رویّے پر متعجب ہے کہ آخر ایسا کیا ہے جس کے دیکھ لینے کا خوف اس کے اندر موجود ہے؟یہ سوال کسی خارجی خطرے سے زیادہ باطنی اضطراب اور غیر یقینی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔شاعر اپنے ہی احساسات، خواہشات اور خدشات کو سمجھنے کی کوشش میں تشکیک کا شکار دکھائی دیتا ہے۔یہ شک کسی خارجی حقیقت پر نہیں بلکہ اپنے باطن، اپنے خوف اور اپنے جذبات کی ماہیت پر ہے۔اس لیے اس شعر میں نفسیاتی تشکیک نمایاں ہے۔

تری گلی سے دبے پاؤں کیوں گزرتا ہوں
وہ ایسا کیا ہے جسے دیکھنے سے ڈرتا ہوں (۹)

کبھی تشکیک کسی بڑے فلسفیانہ سوال سے نہیں بلکہ روزمرہ کے معمولات میں پیدا ہونے والی غیر معمولی تبدیلی سے جنم لیتی ہے۔جب فطرت اپنے مانوس انداز سے ہٹ کر دکھائی دے تو انسان کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھرنے لگتے ہیں۔شاعر بھی ایسی ہی ایک کیفیت سے دوچار ہے۔دن کا آغاز معمول کے مطابق نہیں ہوا،سورج تو موجود ہے لیکن اس کی روشنی غائب ہے جس کے باعث پورا دن کسی انجانے عذاب اور بے یقینی کے احساس سے وابستہ ہو گیا ہے۔بظاہر یہ ایک فطری منظر ہے تاہم اس کے پس منظر میں

OPEN ACCESS

شاعر کی داخلی بے چینی اور زمانے کے غیر معمولی حالات کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔اس شعر میں تشکیک ،مشاہدے اور ظاہری حقیقت کے درمیان پیدا ہوتی ہے۔شاعر ایک ایسی صورتِ حال دیکھ رہا ہے جو معمول کے خلاف ہے اس لیے اس کا ادراک سوال اور حیرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

کٹے گا دیکھیے دن جانے کس عذاب کے ساتھ
کہ آج دھوپ نہیں نکلی آفتاب کے ساتھ (۱۰)

مقتدا حسین ندا فاضلی (۱۹۳۸ء۔۲۰۱۶ء) دہلی میں پیدا ہوئے جب کہ بوجہ ہارٹ اٹیک ممبئی میں وفات پائی۔بعد از تقسیم ان کا خاندان پاکستان آگیا جب کہ ندا فاضلی بھارت ہی میں رہے۔وہ غزل اور ن ظم کے شاعر ہونے کے علاوہ گیت نگار بھی تھے۔ ندا فاضلی کی منظوم تخلیقات میں "لفظوں کا پُل"، "مور ناچ"، "آنکھ اور خواب کے درمیان میں"، "کھویا ہوا سا کچھ"، "شہر میرے ساتھ چل تو"، "زندگی کی طرف"، "سب کا ہے ماہتاب" اور "شہر میں گاؤں (کلیات)" شامل ہیں۔ندا فاضلی کے کلام میں مختلف پہلوؤں سے تشکیکی عناصر کا سراغ ملتا ہے۔

کائنات میں انسان کی عملی مصروفیات اور الوہی تصور کے باہمی تعلق پر سوال اٹھا کر شاعر نے تشکیکی فضا قائم کی ہے۔وہ زمینی سطح پر انسان کے بے شمار کاموں اور ذمہ داریوں کا حوالہ دے کر آسمانی سطح پر خدا کے تصور کی معنویت اور موجودگی کے مقصد پر استفہامی انداز میں غور کی دعوت دیتا ہے۔یہ سوال انکار یا الحاد پر مبنی نہیں بلکہ عقیدے کی عقلی تفہیم اور اس کے محلِ وجود پر غور کا تقاضا کرتا ہے۔

کام تو ہیں زمیں پر بہت
آسماں پر خدا کس لیے؟(۱۱)

جو قول ایک عرصہ سے رائج ہو، کیا اسے صحت کا تصدیق نامہ مل جاتا ہے؟ زیرِ نظر شعر میں سنی سنائی صداقتوں پر چوٹ کی گئی ہے۔شاعر نے مروجہ تصورات کو بلاواسطہ تسلیم کرنے کے بجائے تجربے کی شرط عائد کی ہے۔"کہا گیا ہے" جیسے غیر شخصی جملے روایت اور سنے سنائے علم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔وہ کسی قطعی انکار کے بجائے سوال اٹھاتا ہے کہ جو بات نسل در نسل بطور حقیقت قبول کی جاتی رہی کیا واقعی وہ اتنی ہی سچی ہے؟ پھر ستاروں کو چھونا محض فلکی عمل نہیں بلکہ انسانی امکانات کی علامت ہے۔تجربے کی بات کر کے شاعر علمِ روایت کے مقابل علمِ تجربہ کو رکھ دیتا ہے اس کے الفاظ "کبھی تجربہ کیا جائے" سائنسی طریقِ کار کی نمائندگی کرتے ہیں۔وہ حقیقت کو مفروضے کے درجے پر لا کر جانچنے کی بات کرتا ہے۔دعوے کو جانچنے کی خواہش کا محرک لیے ہوئے یہ شعر سائنسی اور فکری تشکیک کی نمائندگی کرتا ہے۔

کہا گیا ہے ستاروں کو چھونا مشکل ہے
کتنا سچ ہے کبھی تجربہ کیا جائے (۱۲)

وقت ناپائیدار اور تلون طبع ہے،شاعر نے وقت اور انسانی رشتوں کی ناپائیداری پر سوال اٹھا کر ایک نیا زاویہ نظر دیا ہے۔وہ وقت کی بے وفائی اور رشتوں کی عارضی نوعیت پر شک کرتا ہے۔"بنجارا صفت" وقت کا استعارہ ہے جو کسی ایک جگہ یا تعلق سے وابستہ نہیں رہتا۔لمحہ بہ لمحہ بدلنے والا وقت اس سوال کو جنم دیتا ہے کہ آخر اس دنیا میں مستقل کون ہے؟ یہ استفہام محض جذباتی نہیں بلکہ وجودی ہے۔یہ شعر انسانی تعلقات کی پائیداری پر سوال اٹھاتا ہے۔اس کا استفہامی اسلوب ایسی بے یقینی کو نمایاں کرتا ہے جس میں سماجی تعلقات اور ذاتی نسبتوں کی حقیقت پر شک پیدا ہوتا ہے۔

وقت بنجارا صفت لمحہ بہ لمحہ اپنا
کس کو معلوم! یہاں کون ہے کتنا اپنا (۱۳)

سماجی سطح پر معمولات محض روزمرہ اعمال نہیں ہوتے بلکہ اقدار، روایات اور طاقت کے ڈھانچوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔جب یہی معمولات بغیر تنقیدی شعور کے نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں تو وہ افراد کے اذہان میں سوالات، شکوک اور شبہات کو جنم دیتے ہیں۔سماجی تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ فرد اس مرحلے پر بھی تشکیک کا شکار ہوتا ہے جہاں اجتماعی رویے اس کے ذاتی فہم، تجربے یا بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت نہیں رکھتے۔اظہارِ محبت کی صداقت پر شک کیا گیا ہے۔"تمھارا اپنا" جیسے الفاظ یہاں خلوص کی علامت نہیں بلکہ رسم بن چکے ہیں۔شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ الفاظ محض سماجی آداب کا حصہ تو نہیں۔وہ زبان کے رسمی استعمال اور جذبات کی صداقت کے درمیان فاصلے کو نمایاں کرتا ہے اور محبت کے اظہار کو حقیقی احساس کے بجائے ایک سماجی رسم قرار دیتا ہے۔یہ تشکیک جذباتی تعلقات میں مصنوعی پن کو بے نقاب کرتی ہے۔

خط کے آخر میں سبھی یوں ہی رقم کرتے ہیں
اس نے رسماً ہی لکھا ہو گا تمھارا اپنا (۱۴)

سخن زیریں میں زندگی کو سفر سے تعبیر کیا گیا ہے، ایسا سفر جس میں منزل کا تعین واضح نہیں بلکہ نظر میں کوئی دھندلا سا منظر مستقل ٹھہرا ہوا ہے۔شاعر کو خود بھی یقین نہیں کہ وہ کس کو ڈھونڈ رہا ہے؟ اس کے نزدیک انسان کسی نامعلوم منظر کی تلاش میں ہے جس کی ماہیت خود اس پر بھی آشکار نہیں۔یہ کیفیت انسان کے مقصدِ حیات پر سوال اٹھاتی ہے جو کہ وجودی تشکیک کی نمائندہ ہے جس کے تحت ہستی کا مقصد سوال بن گیا ہے۔

نہ جانے کون سا منظر نظر میں رہتا ہے

OPEN ACCESS

CC BY

تمام عمر مسافر سفر میں رہتا ہے (۱۵)

شاعری محض انفرادی احساسات کا اظہار نہیں بلکہ معاشرتی اقدار، روایات اور اجتماعی رویّوں کی معنوی ترجمان بھی ہوتی ہے۔ شاعر اپنے عہد کے سماجی معمولات، اخلاقی تصورات اور رائج روایات کو لفظی پیکر عطا کرتا ہے، کبھی ان کی توثیق کے ذریعے اور کبھی تشکیک و تنقید کے آئینے میں رکھ کر۔ اس طرح شاعری معاشرے کے باطنی تضادات، قدروں کی شکست وریخت اور روایات کی معنویت پر سوال اٹھاتی ہے اور قاری کو سماجی شعور کی نئی سطح سے روشناس کراتی ہے۔ پیش نظر شعر میں شاعر نے عہدِ حاضر کی فکری و تہذیبی بے سمتی کو اجاگر کیا ہے جس میں زمانے کی بے یقینی اور اقدار کی تقلیب پر شک کا اظہار ہے۔ اس کے خیال میں فطری علامتیں بھی اپنی پہچان کھو بیٹھی ہیں۔ چاند اور سورج جیسے مسلمات کا اپنے مقررہ وقت پر نہ ہونا اقدار کے بکھراؤ کی علامت ہے۔ اس شعر میں شاعر اس عدمِ استحکام کو بیان کرتے ہوئے سماجی نظم اور معنوی یقین پر سوال اٹھاتا ہے۔ یہ تصور سماجی و تہذیبی تشکیک کے زمرے میں آتا ہے۔

عجیب دور ہے یہ، طے شدہ نہیں کچھ بھی

نہ چاند شب میں نہ سورج سحر میں رہتا ہے (۱۶)

بعض اوقات چیزیں واضح نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے کچھ سمجھ نہیں آتی موجود اور غیر موجود کے درمیان حد تشکیک کو ہوا دیتی ہیں۔ شاعر اس ہستی کی بات کرتا ہے جو ہے بھی اور نہیں بھی، جو محسوس تو ہوتی ہے مگر دکھائی نہیں دیتی۔ جس کی غیر موجودگی ہی اصل معنی رکھتی ہے۔ یہاں حقیقت کو براہِ راست نہیں بلکہ خلا کے ذریعے پہچانا گیا ہے۔ قصے میں جو نہیں ہے وہی بات خاص ہے، جس بات کا فسانے میں ذکر نہیں وہی اصل بات ہے۔ حقیقت کے غیر مستقیم ادراک کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اسلوب فلسفیانہ تشکیک کی علامت ہے جہاں عدم بھی معنی پیدا کرتا ہے اور وجود سوال بن جاتا ہے۔ یہ اداسی دراصل خارجی حقیقت سے زیادہ داخلی احساس کا سایہ ہے جو یقین اور وہم کے بیچ معلق رہتا ہے۔

یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی آس پاس ہے

وہ کون ہے جو ہے بھی نہیں اور اداس ہے(۱۷)

شاہد ماہلی (۱۹۴۳ء۔۲۰۱۹ء) کا خاندانی نام شاہد حسین تھا۔ ان کی پیدائش اعظم گڑھ کے قصبہ ماہل میں ہوئی۔ آپ آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹر کرنے کے بعد بابولال جسوال کالج مرزاپور میں لیکچرار اردو تعینات ہوئے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی سے وابستگی کے بعد تحقیقی اور ادبی مجلے "غالب نامہ" کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے۔ ان کی کتابوں میں "کہیں کچھ نہیں ہوتا"، "فیض احمد فیض: عکس اور جہتیں"، "رنگ سب رنگ" اور "شہر خاموش ہے" وغیرہ شامل ہیں۔ شاہد ماہلی کی غزلیہ شاعری کے متعلق ڈاکٹر تقی عابدی رقم طراز ہیں کہ

"شاہد ماہلی نظم اور غزل کہتے ہیں لیکن ہماری نظر میں وہ دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار میں داخلیت، خارجی مشاہدوں سے دل و جگر کے الاؤ میں پک کر ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ یہ شکستگی اور قنوطیت نہیں بلکہ عزم اور رجائیت کی کیفیت ہے جو عصر حاضر سے مربوط زندہ شاعری کی علامت ہے۔"(۱۸)

اپنے علم و ادراک پر شبہ کرنا، تشکیک کا ایک اہم پہلو ہے اور یہ شک صرف منفی یا منہدم کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ ایک تحقیقی، تنقیدی اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے والا عمل ہوتا ہے۔ علم میں شک اس لیے ضروری ہے تاکہ ہم غلط فہمیوں، غلط معلومات اور مبہم نظریات سے بچا جاسکے اور حقیقی، مضبوط اور مستند علم حاصل کر سکیں یہ شعر فلسفیانہ تشکیک کی ایک عمیق تصویر پیش کرتا ہے جہاں شاعر اپنی ذات اور حقیقت کے ادراک میں الجھن کا اظہار کرتے ہوئے گویا ہے کہ جو کچھ اس نے سمجھا یا دیکھا وہ حقیقت کی مکمل تصویر نہیں تھی بلکہ ایک محدود اور مبہم فہم تھی۔ اس ادراک کی کمی اور الجھن نے شاعر کی ذات کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس کی کیفیت انسانی فہم کی کمزوری اور حقیقت کی گہرائیوں میں چھپی پہیلیوں کی غماز ہے۔

جو سمجھا وہ نا سمجھی تھی، جو دیکھا وہ ان دیکھی

اس نا سمجھی، ان دیکھی میں، الجھی اپنی ذات (۱۹)

یہ حقیقت ہے کہ انسان کا علم محدود ہے اتنی زیادہ ترقی کے باوجود وہ ابھی تک کیا، کیوں، کہاں اور کون کی گتھیاں سلجھانے میں سرگرداں ہے۔ زیر مشاہدہ شعر میں شاعر اپنے شعور کی حدوں اور حقیقت کی گہرائیوں کے بارے میں سوالات اٹھا رہا ہے۔ "اُدھر کون ہے، کہاں ہے، اُدھر کیوں ہے اور کیا ہے؟" جیسے سوالات ہماری معرفت کی حدوں اور وجود کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کا "پردۂ تجسس" ابھی تک اٹھا نہیں ہے اور وہ ابھی تک حقیقت کی مکمل سمجھ سے محروم ہے اور اس کے ذہن میں متعدد الجھنیں موجود ہیں۔

اُدھر کون ہے، کہاں ہے، اُدھر کیوں ہے اور کیا ہے؟

میرا پردۂ تجسّس ابھی تک اٹھا نہیں ہے (۲۰)

انسان کی غیر مختتم خواہشات کے بت چپکے چپکے دل میں بیٹھ کر یقین کو دھندلا اور نورِ ایمان کو بے نور کر دیتے ہیں۔ زیر مشاہدہ مصرعوں میں ایک ایسے ذہنی اور روحانی اضطراب کو پیش کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں دل کا آئینہ اتنا دھندلا چکا ہے کہ سچ، جھوٹ، خدا اور خود اپنی پہچان سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ لفظ "بت" سے مراد محض مورتی نہیں بلکہ وہ تمام جھوٹی وابستگیاں، خواہشات اور فکری بت ہیں جو انسان کے باطن پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ شاعر حیرت اور اضطراب کے عالم میں ہے کہ جب دل ہی صاف نہ رہا تو عکسِ خدا کیسے پہچانا جائے؟ اس شعر میں ایمان کی نفی نہیں کی گئی بلکہ اس پر چھا جانے والے پردوں، وسیلوں اور خود ساختہ بتوں پر سوال اٹھایا گیا ہے۔ یہ شک انسان کی اپنی بصیرت اور اس کی روحانی آلودگی سے پیدا ہوا ہے۔

بتوں نے اس قدر دھندلا دیا ہے آئینہ دل کا

کہاں ہے کون ہے عکس خدا بھی بھول جاتا ہوں (۲۱)

زندگی اور موت کے فلسفے کا بیان اردو شاعری کے مستقل موضوعات میں سے ایک ہے۔ شاہد ماہلی نے زندگی کو ایک طویل سفر یا قافلے کی مانند سمجھا ہے جو صدیوں سے گزر رہا ہے تاہم اس کا آخری ٹھکانہ یا منزل ابھی تک نامعلوم ہے۔ وہ وجود، وقت اور موت کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھاتا ہے کہ یہ زندگی کس سمت جا رہی ہے اور اس کے سفر کا انجام کیا ہوگا؟ شاعر نے انسان کی معرفت، کائنات کی حقیقت اور وقت کے دھارے میں زندگی کے معنی تلاش کرنے کی کوشش ہے۔ اس میں عدم یقینی اور سوال کا عنصر گہرائی سے جھلکتا ہے جو انسانی شعور کی ایک بنیادی کیفیت ہے۔

نہ جانے کون سی منزل پہ جاکے ٹھہرے گا
وہ ایک قافلہ صدیوں سے جو گزرتا رہا (۲۲)

زمانے کے متعلق اظہارِ خیال سدا بہار موضوع ہے جب کہ زیر نگاہ شعر میں زمانے کی کیفیت خود ایک سوال بن گئی ہے۔ زمانے کی عجیب ضد یہاں موضوعِ سخن ہے۔ ہمیں سب کچھ انتہائی سرعت سے بدلتا ہوا محسوس ہوتا ہے مگر نتیجتاً کوئی حقیقی پیش رفت نظر نہیں آتی۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت دو متضاد سمتوں میں ایک ساتھ چل رہا ہو۔ شاعر اس تضاد پر متحیر ہو کر استفسار کرتا ہے کہ یہ کیسا عہد ہے جس میں حرکت بھی ہے اور جمود بھی۔ یہ فلسفیانہ نوعیت کی تشکیک ہے کیوں کہ یہ وقت، تاریخ اور انسانی سفر کے معنی پر سوال اٹھاتی ہے۔

کس موڑ پہ آ پہنچا ہے شاہد یہ زمانہ
رفتار قیامت کی ہے ٹھہرا بھی ہوا ہے (۲۳)

مذکورہ بالا شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ایک اور شعر جس میں بیان ہوا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان ایک مسلسل سفر میں ہے مگر اس سفر کی آخری سمت آج تک ایک عقدہ ہی بنی ہوئی ہے۔ انسانوں کا قافلہ در قافلہ جانا صرف زندگی کی روانی کی بات نہیں بلکہ اس انجام پر سوال اٹھایا جا رہا ہے جو اس کی منزل ہے جہاں ہر قافلہ بالآخر جا پہنچتا ہے۔ زندگی کا ایک مقررہ عرصہ گزارنے کے بعد انسان موت سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہاں جاتا ہے؟ یہ سوال اب تک راز ہی ہے۔ انجام سے بے خبری اور لاعلمی، انسان کہاں سے آیا ہے اور زیست کرنے کے بعد کہاں قیام کرتا ہے؟ جیسے سوالات کسی ایک فرد یا سماج کے متعلق نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ، وجود اور مقصدِ حیات پر اٹھائے گئے ہیں۔

ابتدائے آفرینش سے نہ یہ عقدہ کھلا
کس طرف سب جا رہے ہیں قافلے در قافلے (۲۴)

ترصیع، تضاد، تکرار، استفہام اور مراعاتُ النظیر جیسی صنعتوں سے مزین درجِ ذیل شعر فکری اور مذہبی مضامین کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک اضطرابی کیفیت جنم لیتی ہے۔ شاعر نے روزمرہ زندگی کے مناظر کو ہی قیامت، جزا و سزا اور فنا کے استعاروں میں بدل دیا ہے۔ ہر منظر کو محشر کہنا، جنت و دوزخ کے تعین پر سوال اٹھانا اور ہر لقمے کو لقمۂ اجل قرار دینا دراصل اس حیرت اور بے چینی کا اظہار ہے کہ اگر زندگی خود ہی اتنی ہلاکت خیز اور خوف ناک ہو چکی ہے تو پھر آخرت کے وعدے کہاں جا ٹھہرتے ہیں؟ اور ایسے میں انسان کس غرور میں مبتلا ہے؟ شاعر خدا، آخرت یا ایمان کی نفی نہیں کی بلکہ دنیا کی حالت کو دیکھ کر مذہبی تصورات کی معنویت، انسان کے زعم اور انجام کے تصور پر ایسا سوال اٹھایا ہے جو یقین کے اندر ہی سے جنم لیتا ہے انکار سے نہیں۔

ہر منظر ہے محشر کا سماں، جنت ہے کہاں، دوزخ ہے کہاں
ہر لقمہ لقمۂ اجل یہاں، کس زعم میں حضرتِ انساں ہے (۲۵)

انسان کے اندر بہت کچھ ایسا ہے جس کی نہ مکمل تعبیر ممکن ہے اور نہ قطعی وضاحت۔ درج ذیل شعر میں شاعر نے دل کے اندر اٹھنے والی بے نام سی کھلبلی کا نقشہ کھینچا ہے ایسا نقشہ جس کی نہ تو کوئی ظاہری وجہ ہوتی ہے اور نہ کوئی واضح انجام نظر آتا ہے۔ ایک ایسا تجسس جو معنی کا طالب تو ہے مگر معنی دیتا نہیں۔ ایک ایسی خلش جو دکھ بھی پوری طرح نہیں بنتی مگر چین بھی چھین لیتی ہے۔ جسم میں لپکتا ہوا شعلہ دراصل اسی اندرونی بے قراری کی علامت ہے جب انسان خود اپنے احساسات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس میں شعور، وجود اور احساس کی غیر واضح سرحدوں پر سوال اٹھایا گیا ہے۔

ایک بے معنی تجسس ایک بے معنی خلش
ایک شعلہ سا لپکتا جسم میں اکثر لگے (۲۶)

شہپر رسول (۱۹۵۶ء) ضلع امروہہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام چودھری وجیہ الدین ہے۔ وہ اردو ادب میں شاعر، محقق، نقاد اور مضمون نگار کی حیثیت پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف میں "چشم دروں"، "سخن سراب"، اردو غزل میں پیکر تراشی (آزادی کے بعد)" اور "نقش و رنگ" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ شہپر رسول کی شاعری میں فکری اور موضوعاتی تنوع پایا جاتا ہے۔ دیگر عناصر کے علاوہ شک، سوال اور تجسس بھی نمایاں ہیں۔

روزگار کے سلسلے میں انسان کو بعض اوقات اپنے قریبی لوگوں کو چھوڑ کر تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاعر تنہائی اور بے کسی کے کرب کو پیش کرتے ہوئے اس جگہ کی تصویر کشی کر رہا ہے جہاں نہ کوئی سایہ ہے، نہ کوئی سہارا، نہ کوئی ہمسایہ، یعنی کوئی ساتھ دینے والا نہیں۔ عہدِ شاہ جہاں کے ممتاز شاعر چندر بھان برہمن نے بھی اسی نوعیت کا ایک شعر کہا ہے۔ دونوں اشعار کے مابین معنوی اشتراک اور مماثلت "توارد" کی مثال ہے۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

OPEN ACCESS

نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالہ ہے (۲۷)

پیش نظر شعر میں "آب ودانہ "سے مراد پانی اور خوراک ہے یعنی زندگی کی بنیادی ضروریات۔ زندگی کے وسائل کی خاطر ایسے گوشے میں پہنچ گئے ہیں جہاں تنہائی اور ویرانی چھائی ہوئی ہے۔اس میں ایک طرح کی سماجی تشکیک جھلکتی ہے۔

کوئی سایہ نہ کوئی ہمسایہ ہے

آب و دانہ یہ کس جگہ لایا (۲۸)

خوف آدمی کے پیدائشی جذبات میں سے ہے، بسا اوقات تو وہ اپنی سے آہٹوں سے ڈر جاتا ہے۔ شہپرؔ رسول نے یہاں ایسے ہی اندرونی خوف اور بے چینی کی عکاسی کرتے ہیں۔وہ اپنی ہی خلوت سے خوفزدہ ہونے اور اپنے ہی قدموں کی آوازوں سے وحشت محسوس کرنے یعنی وہ خود اپنے ہی جذبات اور خیالات سے بے قرار ہے۔دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر نئے ماحول میں اضطراب پایا جاتا ہے جب کہ آبائی حویلیاں چاہے ٹوٹی ہوئی، خستہ حالت میں کیوں نہ ہوں ان میں کچھ سکون سا محسوس ہوتا ہے جن سے ماضی کی یادیں جڑی ہوتی ہیں۔ان سوالات میں نفسیاتی تشکیک پائی جاتی ہے جو خودشناسی اور داخلی الجھنوں کی عکاس ہے جس کے ذریعے شاعر نے اپنی روحانی کیفیت اور جذباتی کشمکش کو بیان کیا ہے۔

خائف ہے مجھ سے میری ہی خلوت، مگر یہ کیوں

اپنی ہی آہٹوں سے ہے وحشت مگر یہ کیوں

ہر اک نئے مکاں کی فضا میں ہے اضطراب

ٹوٹی حویلیوں میں ہے راحت، مگر یہ کیوں (۲۹)

شدید حبس کے موسم میں ہوا کا چلنا کسی نعمت سے کم نہیں۔درج ذیل مقطع میں زندگی کی متضاد حقیقتوں کی عکاسی کی گئی ہے کہ دوشِ باد یعنی ہوا کی گرد میں ایک عجیب غبار آیا ہے۔شاعر نے رحمت اور زحمت کو ایک ساتھ جوڑا ہے جیسے زندگی میں آسانیوں کے ساتھ مشکلات بھی آتی ہیں۔شاعر حیران ہو کر سوال کرتا ہے کہ رحمت کے ہاتھوں میں زحمت کا تحفہ کیوں ہوتا ہے؟ کیوں خوشیوں کے ساتھ دکھ بھی وابستہ ہوتے ہیں؟ یہ فکر انسانی وجود کی پیچیدگی اور کائناتی فلسفے کی ایک گہری تشکیک ہے جو زندگی کے تجربات میں ملے جلے احساسات اور تضادات پر سوال اٹھاتی ہے۔

آیا ہے دوشِ باد پہ شہپر عجب غبار

رحمت کے ہاتھ تحفۂ زحمت مگر یہ کیوں (۳۰)

انسان دوسروں کے چہرے دیکھ سکتا ہے مگر اپنا چہرہ دیکھنے کے لیے آئینے کا محتاج ہے۔زیر نظر شعر انسان کی اسی حاجت کے تحت خود شناسی اور اپنی ذات کی پہچان سے متعلق سوال اٹھاتا ہے۔جب کوئی شخص اپنے اندر کے حقیقت کو سمجھنے یا اپنے وجود کا صحیح ادراک کرنے سے قاصر ہو تو ایسے میں اس کے پاس نگاہ اور آنکھیں کیوں ہیں؟یعنی ظاہری بصارت کے باوجود اندرونی بصیرت کا فقدان کیوں ہے؟شاعر نے انسان کی اندرونی الجھن اور خود فہمی کے بحران کو اجاگر کیا ہے جو کہ فلسفیانہ تشکیک کی بہترین مثال ہے۔یہ سوال انسان کی شناخت اور شعور کی حدود پر روشنی ڈالتا ہے۔

جب آدمی خود ہی اپنا چہرہ نہ دیکھ پائے

تو اس کے حصے میں آنکھیں کیوں ہیں نگاہ کیوں ہے؟(۳۱)

تشکیک کی صورت میں اشیا واضح طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔پیش نظر بیت میں ایک نفسیاتی اور فلسفیانہ تشکیک کی جھلک نمایاں ہے۔شاعر اپنی نگاہوں اور ذہن کے حالات پر سوال اٹھاتا ہے وہ ہر دو جہات کو بیان کرتا ہے کہ یہ آنکھوں کی خطا ہے یا سارا منظر ہی دھندلاہٹ کا شکار ہے؟مطلب یہ کہ کیا جو میں دیکھ رہا ہوں وہ میری آنکھوں کی کمی یا غلطی ہے یا یہ کہ اصل دنیا ہی دھندلا اور مبہم ہے؟ تشکیک کا یہ فلسفیانہ پہلو حقیقت اور ادراک کے درمیان فرق پر غور کرنے کی دعوت ہے۔

یہ خطا آنکھوں کی ہے یا سارے منظر دھند ہیں

اک اندھیرا سامنے ہے جب جہاں دیکھوں تجھے (۳۲)

ڈاکٹر ماجدؔ دیوبندی(۱۹۶۴ء)بھارت کے معروف نعت گو، غزل گو اور نظم گو شاعر ہیں۔وہ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن(ٹیلی ویژن) سے بھی وابستہ رہے۔ان کی شعری تصانیف میں ''لہو لہو آنکھیں''، '' شاخِ دل''، ''ذکرِ رسول''، "وہ میرا نبی ہے" اور ''جگنو بولتا ہے'' وغیرہ شامل ہیں۔ان کی علمی و ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے جمہوریہ ایوارڈ، اردو شاعری ایوارڈ، فروغ اردو ایوارڈ، غالب ایوارڈ، یو۔پی۔اردو اکیڈمی ایوارڈ، اردو سبھا شاعری ایوارڈ، علامہ اقبال اردو شاعری ایوارڈ اور آبروئے غزل ایوارڈ کے علاوہ بیسیوں اعزازات سے نوازا گیا۔ روایتی غزل جہاں عشق و جمال کو یقینی اور مانوس سچائیوں کے طور پر پیش کرتی ہے وہیں ماجد کے ہاں یہ مضامین سوالیہ فضا میں ڈھل کر اپنی ہی معنویت پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔

سدا ایک سی کیفیت نہیں رہتی بلکہ مزاج میں تلون اس کا خاصہ ہے۔شاعر ایک ایسے داخلی اضطراب کا اظہار کر رہا ہے جو انسان کے وجود اور باطن کے سکون پر سوال اٹھاتا ہے۔اس کے سینے میں دل ایک قیدی کی مانند تڑپتا ہے اور اس تڑپ کا شور ہر وقت گونجتا رہتا ہے۔سینے کو قید خانے اور دل کو قیدی سے تشبیہ دے کر وہ اپنے گمان کا اظہار کر رہا ہے کہ ہر وقت کے نالہ و شیون سے تو لگتا ہے کہ میرے سینے میں دل نہیں بلکہ کوئی قیدی رہتا ہے۔وہ اس کیفیت میں زندگی کے ظاہری سکون کو چیلنج کرتا ہے اور وجود کے اندرونی انتشار کو سامنے لاتا ہے۔اس احساسِ قید اور بے اطمینانی کے ذریعے وہ آزادی اور داخلی سکون پر شکوک کا اظہار کرتا ہے۔

cc BY

شور ہمیشہ رہتا ہے اس کوچے میں
دل ہے یا سینے میں اک زندانی ہے (۳۴)

حق و باطل اردو شاعری کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے۔ حق کی حمایت کو احسن تصور کیا جاتا ہے۔ دین اسلام میں نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ ظلم کی حمایت کرنا تو ظلم ہے، گناہ میں مدد دینا جرم ہے، تاہم حق بات کی تائید و توثیق اور طرف داری کو جرم تصور کرنا شک میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ظالم کا حامی ظالم ہے مگر حق سچ کا حامی بھی مجرم قرار پائے؟ یہ تضاد تشکک پرور ہے۔ حق پر باطل کا غلبہ ہونا بعید از قیاس ہے۔ ظلم کو طاقت اور شرافت کو کمزوری قرار دینا معاشرتی اور اخلاقی رویوں پر سوالیہ نشان ہے۔ یہاں مذہبی پہلو بھی نمایاں ہے۔

تائید حق بھی جرم ہے آخر یہ کس لیے
کیوں روشنی کے رخ پہ اندھیرے سے چھا گئے (۳۵)

مسجد اللہ کا گھر ہے اس میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔ مساجد خالصتاً اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص ہیں، جہاں دنیاوی معاملات خصوصاً ناپسندیدہ افعال ممنوع ہیں۔ شاعر نے مسجد ایسے مقدس مقام پر غیبت جیسی معاشرتی برائی اور گناہ پر سوال اٹھایا ہے۔ وہ حیران ہے کہ لوگ اس جگہ بھی چغلی چکاری سے باز کیوں نہیں آتے؟ حالاں کہ چغلی کو "مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے" کے مترادف تصور کیا گیا ہے۔ مسجد تو در کنار کسی جگہ بھی اس کی اجازت نہیں۔

یہ مسجد تو خدا کا گھر ہے ماجد
یہاں کیوں لوگ غیبت کر رہے ہیں (۳۶)

الفاظ کی معنوی تحریف بھی شکوک و شبہات کو جنم دینے کا سبب بنتی ہے کیوں کہ جب لفظ اپنے معنی کھونے لگیں تو سچائی کا چہرہ بھی اجنبی ہو جاتا ہے۔ پہچان کی بنیاد ڈگمگانے لگتی ہے اور انسان یہ طے نہیں کر پاتا کہ جو کچھ دکھائی دے رہا ہے وہ حقیقت ہے یا اس کا الٹ؟ یہاں بھی ایسی ہی کیفیت ابھرتی ہے کہ پیار کے نام پر نفرت کے دیے جلائے جا رہے ہیں اور نفرت کو محبت کا عنوان دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ گویا جذبات کی اصل پہچان مسخ ہو چکی ہے اور الفاظ اپنے حقیقی مفہوم سے ہٹ کر ایک فریب کا روپ دھار چکے ہیں۔ در حقیقت اس شعر میں تناقضی کیفیت کے ذریعے تشکیک پیدا کی گئی ہے۔ پیار اور نفرت دو متضاد جذبات کے حامل ہیں مگر شاعر انھیں اس طرح باہم بدلتا ہے کہ دونوں کی حدیں دھندلا جاتی ہیں۔ شاعر اس الٹی ہوئی دنیا پر سوال اٹھاتا ہے کہ آخر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا، محبت کہاں ہے اور نفرت کہاں چھپی ہے؟ اس میں شاعر صرف معنی نہیں الٹ رہا بلکہ ایک بڑی معنوی کشمکش پیدا کر رہا ہے۔ یہ تناقض قاری کو شک میں مبتلا کرتا ہے اور اسے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ یہاں پیدا ہونے والی کیفیت میں شک کسی ایک فرد کے باطن تک محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرتی رویے اور اقدار کی صداقت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔

پیار کے نام سے نفرت کے دیے جلتے ہیں
اور نفرت کو یہاں پیار کہا جاتا ہے (۳۷)

ذو معنویت اور ابہام بھی شک کے پیدا کار ہیں۔ زیرِ مطالعہ اشعار کی اصل قوت اسی ابہام، ذو معنویت اور سوال میں ہے ایک طرف فطرت کا معصوم منظر جب کہ دوسری طرف محبت کا دردناک تجربہ سامنے آتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اشک باری کی نسبت ایک سوالیہ انداز میں قائم رہتی ہے جو تشکیک کو گہرائی دیتی ہے۔ اول الذکر شعر خارجیت جب کہ مؤخر الذکر شعر داخلیت کا نمائندہ ہے۔ پہلا زاویہ فطری اور تصویری ہے۔ عارضِ گل سے مراد پھول خصوصاً گلاب کا چہرہ لیا جائے تو اس پر چمکتی ہوئی شبنم کے قطرے موتیوں کی صورت دکھائی دیتے ہیں۔ سدا اشک بار رہنے کے متعلق سوال دراصل ایک لطیف استعاراتی سوال ہے۔ گویا کوئی انجانی قوت یعنی قدرت، صبح کی ہوا یا کائناتی نظام وغیرہ کیا ہے جو ہر صبح پھول کے رخسار پر آنسو بکھیر دیتا ہے؟ اس سطح پر شعر ایک فطری منظر کو حیرت اور تجسس کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو عشقیہ اور انسانی ہے۔ اسی عارضِ گل کو اگر محبوب کے رخسار پر محمول کیا جائے تو موتی آنسوؤں کا استعارہ بن جاتے ہیں جو حسن کے ساتھ جڑے ہوئے دکھ اور رنج کی علامت ہیں۔ اب "یہ کون ہے؟" کا سوال مزید گہرا ہو جاتا ہے کیا محبوب خود کسی غم میں مبتلا ہے؟ یا عاشق کی وجہ سے اس کے چہرے پر یہ آنسو ہیں؟ یہاں کیفیت خارجی منظر سے ہٹ کر ایک داخلی کرب کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ شدّتِ غم بھی یقین کو کمزور کر دیتی ہے پھر ہر شے مشکوک محسوس ہونے لگتی ہے محبت بھی، یادیں بھی حتٰی کہ خود اپنی ذات بھی۔ اس کیفیت میں تشکیک دراصل ذہنی انتشار اور جذباتی دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محبوب سے جدائی کا دکھ عاشق کو ہمہ وقت بے چین کیے رکھتا ہے۔ اس صورت حال میں اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا کرے جس سے قرار خاطر حاصل ہو۔

یہ کیسے موتی مچلتے ہیں عارضِ گل پر
یہ کون ہے جو سدا اشک بار رہتا ہے
میں کیا کروں کسی پہلو بھی دل کو چین نہیں
بچھڑ کے تجھ سے بہت بے قرار رہتا ہے (۳۸)

اقبال اشہر (۱۹۶۵ء) بھارتی دارالحکومت دہلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ منفرد اندازِ بیان کے باعث اقبال اشہر مختلف ممالک کے عالمی مشاعروں میں شریک ہوئے۔ ان کی تصانیف میں "دھنک ترے خیال کی"، "ر تجگے"، "اردو ہے مرا نام" اور "شاعروں کے قصے" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال اشہر کی غزل میں تشکیک کا عنصر مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ سوال، تذبذب اور فکری جستجو کے ذریعے رائج تصورات کو نئے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

کسی کا ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا، گھورنا یا عقیدت سے دیکھنا بھی مشکوک ٹھہرتا ہے۔ درج ذیل شعر اسی طرح کی ایک لمحاتی الجھن اور اندرونی سوال کی صورت سامنے آتا ہے جب شاعر سامنے والے کی نگاہوں میں چھپی نیت پر ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ اتنی عقیدت، اتنی توجہ؟ کیا یہ احترام ہے یا اس کے پیچھے کوئی توقع، کوئی پیش گوئی، کوئی معنی پوشیدہ ہے؟ یہاں شاعر اپنے وجود کو کسی علامت یا نشان میں بدلے جانے پر حیران بھی ہے اور محتاط بھی۔ ایسی تشکیک سماجی تشکیک کے زمرے میں آتی ہے کہ سوال فرد کے ذاتی احساس سے نکل کر معاشرتی رویّوں، لوگوں کی نظروں اور بے جا تقدیس پر اٹھتا ہے۔ انسان خود سے پوچھنے لگتا ہے کہ لوگ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟

کیوں اتنی عقیدت سے مجھے دیکھ رہے ہو
کیا کوئی بشارت مرے ماتھے پہ لکھی ہے (۳۹)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا علیہم السلام کی تخلیق کے بعد انھیں جنت میں رکھا۔ پھر دونوں حضرات بوجوہ زمین پر تشریف لائے۔ شاعر نے انسان کے جنت سے زمین پر نزول کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ بظاہر کشش، روشنی اور دلکشی کی بات کرتا ہے مگر اس کے باطن میں انسان کے اوّلین نزول کا سوال چھپا ہوا ہے۔ شاعر عالم حیرت میں ہے کہ وہ کون سا حکم، کون سی آزمائش یا کون سی لغزش تھی جس نے نورانی پرواز کو زمین کی خاک سے جوڑ دیا؟ یہ سوال دراصل نزولِ آدمؑ کے واقعے کے گرد گھومتا ہے مگر اس میں یقین کے دعوے کے بجائے ایک ہلکا سا توقف، ایک فکری لرزش موجود ہے۔ یہی لرزش مذہبی تشکیک ہے۔ اس میں انکار نہیں بلکہ تقدیر، آزمائش اور خدائی فیصلے کی حکمت پر خاموش سوال ہے۔ شاعر یقین رکھتا ہے، مانتا بھی ہے، سوچتا بھی ہے اور اسی سوچ کے تحت یہ پوچھتا ہے کہ آخر وہ کشش کیا تھی جو انسان کو آسمان سے زمین تک لانے کا سبب بنی؟

وہ کیا کشش تھی جس نے پرواز کو روشنی دی
وہ کون سی دلکشی تھی جس نے زمین پر اتارا (۴۰)

سہل ممتنع کے انداز میں چھوٹی بحر کے استعمال سے مزین یہ شعر سیدھا سا مشورہ معلوم ہوتا ہے مگر اندر سے ایک سوالیہ الجھن کو جنم دیتا ہے۔ آسان راستہ ڈھونڈنے کی تلقین کے ساتھ ہی دشوار کام کر جانے کی بات کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اسی تضاد یا پیراڈوکس کے ذریعے وہ باور کراتا ہے کہ زندگی میں کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جو آسان نظر آتا ہے وہی مشکل نکل سکتا ہے اور جو دشوار لگے وہی اصل راستہ بن جاتا ہے۔ انسانی انتخاب، ارادے اور کامیابی پر شک پیدا کرتی ہوئی یہ کیفیت فلسفیانہ تشکیک کی ہے۔

کوئی آسان راستہ ڈھونڈو
کوئی دشوار کام کر جاؤ (۴۱)

باہمی **تعلق** کو **سزا** سے تشبیہ دینا دراصل محبت اور رشتے کی مروجہ تقدیس پر سوال اٹھانا ہے۔ عام طور پر تعلق کو راحت، سکون اور وابستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے لیکن جب شاعر اسے سزا قرار دیتا ہے تو وہ اس کے باطن میں پوشیدہ جبر، گھٹن یا بے بسی کو نمایاں کرتا ہے۔ اس اسلوب میں شک اس بات پر ہے کہ کیا ہر تعلق واقعی باعثِ مسرّت ہوتا ہے یا بعض رشتے انسان کی آزادی، خودی اور سکون کے لیے قید خانہ بن جاتے ہیں۔ زیر مشاہدہ شعر ایک ایسی الجھن کو چھوتا ہے جہاں قربت بھی قید لگنے لگتی ہے۔ شاعر حیران ہے کہ یہ ساتھ چلنا واقعی تعلق ہے یا محض ایک ایسی سزا جس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں۔ جدھر محبوب جاتا ہے خود بھی وہیں کھنچتا چلا جاتا ہے، چاہے دل مانے یا نہ مانے۔ اسی کشمکش میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ اختیار کہاں ختم ہوا اور مجبوری کہاں سے شروع ہو گئی؟ یہ پوری کیفیت غزل کے روایتی مضمون عشق و عاشقی کے دائرے میں آتی ہے جس کے ذیل میں محبت اپنی مٹھاس کے ساتھ ساتھ سوال، بوجھ اور بے بسی بھی بن جاتی ہے۔

یہ تعلق ہے یا سزا ہے کوئی
مَیں وہاں جاؤں تم جدھر جاؤ (۴۲)

معاصر حالات سے ماضی کا موازنہ کرتے ہوئے شاعر ماضی کے گہرے انسانی تعلقات اور احساسات کی کمی پر افسوس کرتا ہے۔ وہ دور جب لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹتے تھے اب کہاں گم ہو گیا؟ شاعر نے معاشرتی رویوں اور انسانی تعلقات کی تبدیلی پر سوال اٹھایا ہے۔ یہ تشکیک سماجی نوعیت کی ہے جو انسانی تعلقات کے زوال اور معاشرتی تنہائی پر غور کرتی ہے۔

اک دوسرے کا درد جہاں بانٹتے تھے لوگ
اکثر مَیں سوچتا ہوں وہ دنیا کدھر گئی (۴۳)

اردو غزل میں تشکیک پسندی ایک ہمہ جہت رجحان ہے جو مختلف خطوں میں مختلف انداز سے ظاہر ہوتا ہے اور قاری کو یقین اور سوال کے درمیان ایک بامعنی مکالمے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا ایک پہلو مذہبی تشکیک ہے، یہ رویہ عقائد کو رد کرنے کے بجائے ان کی تفہیم، تاویل اور جواز پر سوال قائم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں فلسفیانہ، سائنسی اور غزل کے روایتی موضوعات میں تشکیک کے اشارے ملتے ہیں۔ معاصر عہد کی فکری فضا میں شک، سوال، اضطراب اور عدمِ یقین کی کیفیات مختلف جغرافیوں میں بسنے والے شعرا کے ہاں بھی در آتی ہیں۔ اس مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ معاصر ہندوستانی غزل میں تشکیک پسندی ایک نمایاں فکری رجحان کے طور پر موجود ہے۔ غزل گو شعرا نے اپنی شاعری میں حقیقت، شناخت، سماجی اقدار، انسانی

تعلقات اور مسلمہ تصورات کو سوالیہ زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ان کے ہاں تشکیک محض انکار یا نفی کا نام نہیں بلکہ غور و فکر، معنوی جستجو اور نئے امکانات کی تلاش کا ذریعہ ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معاصر غزل اپنے عہد کے فکری، سماجی اور تہذیبی مسائل سے گہرا ربط رکھتی ہے اور تشکیک کے ذریعے قاری کو روایتی تصورات پر نظر ثانی کی دعوت دیتی ہے۔اس طرح تشکیک پسندی معاصر غزل کے فکری تنوع، معنوی وسعت اور عصری شعور کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔امین اشرف،سید، بہارِ ایجاد،دیباچہ از شمس الرحمٰن فاروقی (دہلی:ایم کے آفسٹ پرنٹرس،۲۰۰۷ء)،۱۵۔

۲۔امین اشرف،سیّد،جادۂ شب (دہلی:ایم۔کے آفسیٹ،۲۰۱۲ء)،۱۳۔

۳۔ایضاً،ص،۵۸۔

۴۔ایضاً،ص،۵۹۔

۵۔گلزار احمد وانی،ڈاکٹر،شہر یار کی شعری خدمات (پلوامہ:ادیب پبلی کیشنز،۲۰۱۰ء)،۲۵۸۔

۶۔شہریار،کلیاتِ شہر یار (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،۶۱۰۔

۷۔ایضاً،ص ۶۱۳۔

۸۔ایضاً،ص ۶۲۵۔

۹۔کلیاتِ شہر یار،ص۶۳۵۔

۱۰۔ایضاً،ص۶۴۳۔

۱۱۔ندا فاضلی، شہر مرے ساتھ چل تو، پہلی بار(دہلی:نئی آواز،دسمبر۲۰۰۴ء)،۵۶۔

۱۲۔ایضاًص۔۵۶۔

۱۳۔ایضاً،ص۵۷۔

۱۴۔ایضاً،ص۸۶۔

۱۵۔شہر مرے ساتھ چل تو،ص۸۹۔

۱۶۔ایضاً،ص۹۰۔

۱۷۔ایضاً،ص۱۲۶۔

۱۸۔ تقی عابدی،ڈاکٹر،غزل شاہد ماہلی کی حقیقی شناخت،مشمولہ،شاہد ماہلی؛ عکس اور جہتیں،مرتبہ ڈاکٹر رضا حیدر(دہلی:معیار پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء)،۹۰۔

۱۹۔شاہد ماہلی،رنگ سب رنگ(دہلی:معیار پبلی کیشنز،۲۰۱۸ء)،۲۹۔

۲۰۔ایضاً،ص۸۷۔

۲۱۔ایضاً،ص۹۴۔

۲۲۔ایضاً،ص۹۷۔

۲۳۔شاہد ماہلی،کہیں کچھ نہیں ہوتا(دہلی:معیار پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،۱۰۹۔

۲۴۔ایضاً،ص۱۱۰۔

۲۵۔رنگ سب رنگ،ص۱۱۴۔

۲۶۔کہیں کچھ نہیں ہوتا، ص۱۳۳۔

۲۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر(مرتب)،تاریخِ ادبِ اردو،جلد اول،طبع چہارم(لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب،۱۹۹۵ء)،۲،۷۔

۲۸۔شہپر رسول،سخن سراب،(نئی دہلی:ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۲ء)،۳۳۔

۲۹۔ایضاً،ص ۴۳۔

۳۰۔ایضاً،ص ۴۴۔

۳۱۔سخن سراب،ص۴۹۔

OPEN ACCESS

۳۲۔ایضاً،ص۶۵۔

۳۳۔ماجد دیوبندی،ڈاکٹر،شاخِ دل (دہلی:انجم بک ڈپو،۲۰۱۱ء)،۲۳۔

۳۴۔ ایضاً،ص ۴۱۔

۳۵۔ شاخِ دل،ص۔۷۴

۳۶۔ ایضاً،ص۔۸۵

۳۷۔ ایضاً،ص۱۰۷۔

۳۸۔اقبال اشہر،رتجگے (دہلی:کتابی دنیا،۲۰۱۰ء)،۲۸۔

۳۹۔ ایضاً،ص۳۶۔

۴۰۔ ایضاً،ص۴۵۔

۴۱۔ ایضاً،ص۴۵۔

۴۲۔ ایضاً،ص۶۹۔

1. Amin Ashraf, Sayyad, *Bahar-e-Ijad*, dibacha az Shamsur Rahman Faruqi (Delhi: M.K. Offset Printers, 2007), 15.
2. Amin Ashraf, Sayyad, *Jadah-e-Shab* (Delhi: M.K. Offset, 2012), 13.
3. Ibid., 58.
4. Ibid., 59.
5. Gulzar Ahmad Wani, Dr., *Shehryar ki She'ri Khidmat* (Pulwama: Adeeb Publications, 2010), 258.
6. Shehryar, *Kulliyat-e-Shehryar* (Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008), 610.
7. Ibid., 613.
8. Ibid., 625.
9. *Kulliyat-e-Shehryar*, 635.
10. Ibid., 643.
11. Nida Fazli, *Shahr Mere Sath Chal Tu*, pehli bar (Delhi: Nai Awaz, December 2004), 56.
12. Ibid., 56.
13. *Shahr Mere Sath Chal Tu*, 57.
14. Ibid., 86.
15. Ibid., 89.
16. Ibid., 90.
17. Ibid., 126.
18. Taqi Abidi, Dr., "Ghazal Shahid Mahli ki Haqiqi Shanakht," mashmoola *Shahid Mahli: Aks aur Jihaatein*, murattaba Dr. Raza Haider (Delhi: Mayar Publications, 2012), 90.
19. Shahid Mahli, *Rang Sab Rang* (Delhi: Mayar Publications, 2018), 29.
20. Ibid., 87.
21. Ibid., 94.
22. Ibid., 97.
23. Shahid Mahli, *Kahin Kuch Nahin Hota* (Delhi: Mayar Publications, 2003), 109.
24. Ibid., 110.
25. *Rang Sab Rang*, 114.
26. *Kahin Kuch Nahin Hota*, 133.
27. Jamil Jalibi, Dr. (murattib), *Tarikh-e Adab-e Urdu*, jild awwal, tabaʿ chaharam (Lahore: Majlis-e Taraqqi-e Adab, 1995), 72.
28. Shahpar Rasool, *Sukhan Sarab* (New Delhi: Modern Publishing House, 2002), 33.
29. Ibid., 43.
30. Ibid., 44.
31. *Sukhan Sarab*, 49.
32. Ibid., 65.
33. Majid Deobandi, Dr., *Shakh-e-Dil* (Delhi: Anjum Book Depot, 2011), 23.
34. Ibid., 41.
35. *Shakh-e-Dil*, 74.
36. Ibid., 85.

CC BY

37. Ibid., 107.
38. Iqbal Ashhar, *Ratjage* (Delhi: Kitabi Duniya, 2010), 28.
39. Ibid., 36.
40. Ibid., 45.
41. Ibid. 45.
42. Ibid., 69.